الفاتحۃ اُمّ الکتاب

از میر محمد حسین - ایم - اے (فاضل دیوبند)

اس سورت کے مکّی یا مدنی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے ۔ حضرت ابن عباس ، قتادہ ابوالعالیہ اسے مکّی بتاتے ہیں جب کہ حضرت ابوہریرہ ، مجاہد ، عطا بن یسار اور زہری اسے مدنی خیال کرتے ہیں ۔ جہاں تک اسلوب بیان کا تعلّق ہے ، وہ اتنا متوازن اور معتدل ہے کہ اس بنیاد پر کسی ایک رائے کو ترجیح دینا بہت مشکل ہے ۔ خارجی شہادتوں کی بنیاد پر اگرچہ ہمیں ــــ جیسا کہ علّامہ قرطبی نے کہا ہے اس کا مکّی ہونا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ سورۃ الحجر (جو بالاتفاق مکّی ہے) میں نبی علیہ السّلام کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ آتَیْنٰکَ سَبْعًا من المثانی والقرآن العظیم اور ائمہ تفسیر کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سبع مثانی اور قرآن عظیم سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے ۔ نیز مکّہ میں اوّل روز سے نماز ادا کی جا رہی تھی اور حضورؐ کا ارشاد ہے کہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب اس سے لازم آتا ہے کہ سورۂ فاتحہ اس وقت مکّہ میں نازل ہو چکی ہو۔

تاہم سورت کو اس کے مفہوم و مدّعا کے لحاظ سے اگر بیک مکّی و مدنی کہا جائے تو بھی یہ رائے بہت وقیع ہو گی کیونکہ مضامین کے لحاظ سے سورت کے چار حصّے کئے جا سکتے ہیں :

۱ - اللہ تعالیٰ کی تعریف اس کے چار صفاتی ناموں ــــ رب العالمین ، رحمٰن ، رحیم اور مالک یوم الدین ــــ کے ساتھ ۔

۲ - بندے کا اقرار و اعلان کہ وہ صرف اور صرف اسی کی عبادت کرے گا اور صرف اسی سے ہر طرح کی اعانت و مدد طلب کرے گا۔

۳ - اس صراطِ مستقیم پہ چلنے کی دُعا جو انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے۔

۴ - گمراہ اور غضب کا شکار ہونے والوں کی راہ سے بچنے کی دُعا۔

اور قرآن مجید کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات انہی چار بنیادی صفات کا عکس و مظہر یا لازمہ و تتمہ ہیں۔ دوسری چیز جس پہ قرآن مجید میں زور دیا گیا ہے وہ توحید ہے جس کا دو لفظوں میں خلاصہ یہی ہے کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ اور اپنی حاجات و ضروریات کے لیے صرف اور صرف اسی سے مدد مانگی جائے۔ اسی طرح قرآن مجید میں چار ہی قسم کے لوگوں کو خدا کا منعم علیہ بتایا گیا ہے، انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین اور انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے جب کہ باقی جن افراد و اقوام —— ہود، صالح، شعیب اور لوط علیہ السّلام کی قوموں۔ بنی اسرائیل اور نصاریٰ — کا ذکر ہے۔ وہ سب کی سب مغضوب اور گمراہ بتائی گئی ہیں، جن کی راہ کو خسارے اور ناکامی کی راہ بتایا گیا ہے۔

اسی طرح یہ سورت پورے قرآن کی تمہید و دیباچہ یا متن بھی ہے جو شروع میں آیا کرتا ہے اور اس کا خلاصہ و اختصار بھی جو آخر میں دیا جاتا ہے۔ سورت کے اس معجزانہ پہلو کو دیکھا جائے تو اسے بیک وقت مکّی بھی کہا جا سکتا ہے اور مدنی بھی۔

خلاصہ و اختصار ہونے کی صورت میں تو ظاہر ہے کہ اس کتابِ حکیم کے مطالعہ کے بعد جو احساس و تاثر قاری کے دل پہ قائم ہونا چاہیے۔ وہ رب العالمین کی حمد و ثنا، اقرار و اعلانِ بندگی اور دُعائے ہدایت و رہنمائی کی صورت میں اسے تلقین کر دیا گیا تاکہ وہ اسے عمل میں لا کر یوم الدین کی پرسش سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکے۔

اور اگر اسے تمہید و متن قرار دیا جائے تو یہ اُس عقیدت کا اظہار ہو گا کہ ایک خالی الذہن اور سلیم الفطرت انسان جب اپنے اِردگرد شش جہات میں پھیلی ہوئی کائنات پہ غور کرتا ہے تو وہ نہ صرف اس کی ریاضیاتی اُصولوں پہ مبنی اور پُراز حکمت تخلیق پہ حیران و ششدر

رہ جاتا ہے، بلکہ اس کے بنانے والے کی ربوبیت اور بے پایاں رحمت پر بے اختیار تعریف و توصیف بھی کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس نے صرف اس خلاصۂ کائنات ـــــ انسان ـــــ ہی کی جسمانی و روحانی نشوونما اور ارتقار کے لیے ہر طرح کا سازوسامان، زمینوں اور آسمانوں میں ودیعت نہیں کر دیا بلکہ دوسری تمام مخلوقات ـــــ حیوانات، نباتات اور جمادات ـــــ تک کے نشوونما اور ارتقار کے جلی وخفی اسباب مہیا کر دیے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کھکیڑ محض کھیل اور نمائش کے لیے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کارخانے کا کوئی مقصد و مدعا ہوگا اور وہ اس شعور و اختیار کامل رکھنے والی مخلوق ـــــ انسان ـــــ کے جذبۂ تشکر و امتنان کی آزمائش کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے چنانچہ وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ ایاک نعبد کہ "اے رب کائنات! ہم تیری اس بے پایاں رحمت پر مبنی ربوبیت کے سامنے اپنا سر نیاز مندی خم کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں تیرے ہی بندے بن کر رہیں گے۔"

رب کائنات کا جو وجود غور و فکر سے پہلے غیاب و حجاب میں تھا۔ تدبر و تفکّر کے نتیجہ میں اب گویا اس کے لیے مشہود و محسوس بن گیا ہے۔ اس لیے اب وہ اس سے بصیغۂ خطاب مخاطب ہوتا ہے۔

چونکہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جس رب العالمین نے انسان کی تمام مادّی و روحانی ضرورتوں کا پہلے سے بندوبست کر رکھا ہے وہ اس کی آئندہ ضرورتوں کو بھی لازماً کفیل ہوگا اس لیے معاً اس کے دل سے یہ صدا بھی اٹھتی ہے کہ ایاک نستعین کہ "اے ربِّ کائنات! ہم تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنی تمام حاجات اور آرزوؤں کے لیے صرف اور صرف تجھی سے اعانت و مدد کے طلب گار ہوں گے۔"

ان دو جملوں میں اگرچہ حصر موجود ہے جس سے ماسوی اللہ کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے مگر بالصراحت غیر اللہ کی نفی نہ کرنے میں حکمت یہ نظر آتی ہے کہ کائنات کا مطالعہ کرنے والے سلیم الفطرت انسان کا مطالعہ اسے جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے، وہ صرف رب العالمین کے لیے

اپنی بندگی اور صرف اسی سے استعانت کا اظہار ہے جو اگرچہ نفی ماسوی کو متضمن ہے تاہم ابھی اس کا ذہن کسی ماسوی اللہ کی طرف بالقصد متوجہ نہیں۔ اس لیے اس کی بالصراحت نفی کی ضرورت نہ تھی۔ توحید انسان کی فطرت کی آرزو ہے۔ شرک کی آمیزش بعد میں اور خارجی عوامل کی وجہ سے ہوتی۔ اس لیے اس کی نفی اور تردید کی ضرورت بھی بعد میں پیش آئی۔

یہاں تک رب العالمین سے انسان کی وابستگی ذہنی و فکری حد تک تھی، لیکن اسے معلوم ہے کہ عمل کی دنیا میں بہت سی ترغیبات و مشکلات ایسی بھی ہوسکتی ہیں جو اسے بندگی کی اس راہ سے ہٹا دیں یا اُسے اس عہد سے منحرف کر دیں یا اُسے فکری و ذہنی اُلجھن میں ڈال دیں جیسا کہ تاریخ میں ہو چکا ہے، اس لیے معاً بعد اس سے یوں عملی استعانت کرتا ہے کہ وہ اُسے ہمیشہ صراط مستقیم پر چلتا رکھے، جس پر اے رب کائنات! تیرے بندے چل کر انعام یافتہ ٹھہرے اور عملی و فکری گمراہیوں سے محفوظ رہے اور پھر اس رحمٰن و رحیم رب العالمین نے فوراً جواب دیا کہ وہ صراط مستقیم ہماری یہ کتاب ہے، جس کے ہدایت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں (البقرہ) صیغۂ جمع میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ صدا پوری نوع انسانی کی فطرتِ سلیمہ کی صدا ہے۔

قرآن مجید میں رحمٰن و رحیم ہر دو الفاظ کے استعمال کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ رحمٰن اپنے مبانی (حروف) کی کثرت کی طرح اپنے معانی میں بھی وسعت لیے ہوئے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی اس وسیع رحمت کے لیے استعمال ہوا ہے جو تمام انسانوں ——— قطع نظر اس سے کہ وہ کافر ہوں یا مومن ——— پر محیط ہے اور جس کے بغیر انسان، نہ انسان ہوسکتا تھا اور نہ وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا یا اس کائنات میں ترقی و ارتقا کے منازل طے کرسکتا تھا۔ اس وسیع رحمت سے مراد رب العالمین کی عطا کردہ وہ تمام مادّی ذہنی اور روحانی نعمتیں ہیں جو اس نے انسان کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیلا رکھی ہیں قرآن مجید میں جابجا ان کا حوالہ دے کر انسان کو اس کے انکار، اس سے بغاوت یا اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے سے باز رہنے کو کہا گیا ہے۔

قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ لفظ رحیم نسبتاً محدود معنوں میں استعمال

ہوا ہے اور عموماً اس سے مراد خدائے کائنات کی وہ رحمت لی جاتی ہے جس کی بدولت وہ انسان کو اس کی بغاوت و سرکشی سے باز آ جانے پر معاف کر دیتا یا اس کے ساتھ رویّہ درست ہونے پر انسان کی لغزشوں یا مجبوریوں سے درگذر کرتا، اسے سہولتیں بہم پہنچاتا یا اُس کی سرکشی کے باوجود اس پر فوراً گرفت نہیں کرتا، بلکہ اسے مہلت اور ڈھیل دے دیتا ہے۔

سورۃ فاتحہ میں رب العالمین کے بعد صفت الرحمٰن کا ذکر کرنے سے انسان پر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس رب العالمین نے اپنی گوناگوں مخلوق کی تخلیق، اس کے بقا کی تمام ضروریات اور اس کے ارتقاء کے تمام لوازمات جو مہیا کیے ہیں تو محض اپنی رحمت واسعہ و عامہ کی وجہ سے کیے ہیں۔ یہ کسی کا استحقاق یا کسی کی کاوش کا ثمرہ و نتیجہ نہیں۔

ساتھ ہی اپنی رحمت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف لفظ الرحیم لا کر اشارہ فرما دیا کہ بہر حال آفرینش کا یہ سلسلہ بے مقصد و مہمل نہیں، بلکہ اس کی ایک غرض و غایت ہے اور وہ انسان کے جذبۂ تشکر و امتنان کا امتحان ہے۔ اگر انسان نے اس کا ثبوت دیا تو ان دُنیوی نعمتوں کے علاوہ وہ اسے اُخروی نعمتوں سے بھی نوازے گا۔ اور اس کی خوشنودی و رضا اس پر مستزاد ہوگی اور اگر اُس نے بغاوت و ناشکری کی راہ اختیار کی تو اُسے توبہ و اصلاح کا موقع بھی مہیا کیا جائے گا، لیکن اس کی مہیا کردہ ان تمام سہولتوں، آسائشوں اور نعمات سے فائدہ اُٹھانے کے باوجود اگر وہ اپنی باغیانہ روش پر اڑا رہا تو پھر اُسے یومِ جزا کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ پوری طرح اس کی گرفت میں ہوگا اور اُسے اپنی اس روش کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔

سورت کا مرکزی مدعا و مفہوم خدا کے نیک بندوں کی راہ پر چلنے کی آرزو و تمنا ہی ہے جس کا اظہار بندہ اپنے رب کے انعامات کی اُمید۔ اور اس کی گرفت و عتاب کے خوف کے سائے میں، اپنی اسی کے ساتھ وابستگی کے اقرار و اعلان کے بعد کرتا ہے کیونکہ نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ایک مسلمان کو روزمرّہ کی زندگی میں ـــــ گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی ـــــ ہر روز ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جہاں

اگر خدا کی دستگیری حاصل نہ ہو تو وہ کسی بھی وقت راہ راست سے بھٹک سکتا ہے۔ ہر نماز میں اس دعا کے اعادہ و تکرار کی یہی حکمت و علم معلوم ہوتی ہے۔

سورت جہاں اپنے مضامین و مشتملات کے اعتبار سے بایں معنیٰ معجزہ ہے کہ پورے قرآن میں پھیلے ہوئے تمام مضامین اس میں سمٹ آئے ہیں، وہاں اپنے الفاظ، ان کی بندش اور اسلوب کے لحاظ سے اس کو سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں وارد تقریباً ۲۰ الفاظ میں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو عربی اور اردو ہر دو زبانوں کے روزمرہ میں استعمال نہ ہوتا ہوا اور جس کے مفہوم میں کسی قسم کا اشکال و اغلاق یا پیچیدگی ہو مگر اس کے باوجود ان الفاظ سے اتنا حسین و جمیل، سہل اور جامع کلام ترکیب دینا جو ایک پوری کتاب کے مضامین کو اپنے اندر سمولے، انسانی استطاعت سے باہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حیثیت ایک تخم اور بیج کی سی ہے اور باقی سارے قرآن کی ایک شجرۂ طیبہ کی سی۔ جس طرح درخت کی ابتدا ایک بیج سے ہوتی ہے اور پھر آخر میں اس پر لگتا بھی بیج ہی ہے، جس سے اس خلاقِ عالم کی شان ھو یبدئ و یعید کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کا شجرۂ طیبہ پھوٹا بھی سورۂ فاتحہ سے ہے اور اس کی شاخ طوبیٰ پر بیج بھی اسی سورۂ فاتحہ کا لگا۔ اسی لیے اسے بجا طور پر ام الکتاب یا ام القرآن کا نام دیا گیا ہے۔

فللّٰہ الحمد فی الاُولیٰ والاٰخرۃ۔

خواتین کیلیے تین خوبصورت کتابیں			
	۱۔ شمعِ حرم	محمد یوسف اصلاحی	۱۲/- روپے
	۲۔ عورت اور اسلام	جلال الدین عمر	۹/- 〃
	۳۔ عورت قرآن کی نظر میں	شمیمہ محسن	۱۲/- 〃
	البدر پبلی کیشنز۔ ۲۳۔ راحت مارکیٹ۔ اردو بازار لاہور		